پاکستانی اردو افسانے میں ہجرت کا اظہار
(سقوطِ ڈھاکہ کے تناظر میں)

عذرا پروین
لیاقت علی

Abstract:

The political history of indo-pak sub-continent is marked with two mega migrations. Firstly, it was experienced with the emergence of a separate independent state in 1947. Secondly, when the same seperate independent state bifircated into two wings i.e. Pakistan & Bangla desh. The both migrations i.e division of india in 1947 and fall of Dhaka in 1971 gave birth to a number of tragedies on human grounds. These tragedies are very well reflected in their parallel history of urdu short stories. Keeping in view these short stories especially written in view of the Dhaka fall in 1947; present study is indicating those motives which actually gave birth to this huge tragedy in our national history.

اقوامِ عالم کی تاریخ گواہ ہے کہ پاکستان نظریاتی اساس پر قائم ہونے والا ملک ہے۔ ۱۹۴۷ئسے قبل صدیوں تک ایک دوسرے کے ساتھ رہنے والے مشترکہ گنگا جمنی تہذیب کے حامل ہندو اور مسلمان اگرچہ ایک طویل عرصہ تک لسانی و تہذیبی روایات، رسوم و رواج، تہذیب و تمدن، رہن سہن اور عادات و اطوار کے حوالے سے شعوری یا لاشعوری طور پر ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے رہے جس کے نتیجے میں ان کے درمیان مذہبی اختلافات کے باوجود بھی تعلقات پروان چڑھتے رہے لیکن ایسٹ انڈیا کمپنی کی برصغیر آمد اور مقامی لوگوں پر قبضہ و حکمرانی کی خواہش اور منصوبے نے یکا یک ایسے سازشی حالات تشکیل دیے کہ ہر دو اقوام میں موجود مذہبی، تہذیبی اور ثقافتی اختلافات سر اُٹھانے لگے۔ مذہب و قومیت سے جنم لینے والی عصبیت کا زہر ہر دو طرف اس طرح سرایت کرنے لگا کہ وہ ایک دوسرے کی جان کے دشمن اور خون کے پیاسے بن گئے۔ نتیجتاً ہند اسلامی کلچر کا شیرازہ بکھر کر رہ گیا۔ ایک طرف ہندو اکثریت میں ہونے کے سبب برصغیر کے مسلمانوں کے جداگانہ تشخص اور شناخت سے انکاری ہو گئے اور بربریت و جارحیت پر مبنی بعض اقدام اُٹھانے لگے تو دوسری طرف یہاں کے مسلمانوں کو بھی اپنا وجود معدوم ہوتا ہوا محسوس ہوا اور اُنہیں اپنے لیے جداگانہ خطۂ زمین کی ضرورت محسوس ہوئی کہ جہاں وہ مذہبی اقدار و روایات کی پاسداری کے ساتھ

ساتھ اپنے معاشی استحکام کو بھی یقینی بنا سکیں۔

مسلمانانِ برصغیر کے مصمم ارادے اور مذہبی نصب العین سے جنم لینے والے بڑے آدرش کے نتیجے میں ۱۹۴۷ء میں برصغیر میں ایک اسلامی اور کثیر اللسانی مملکت 'پاکستان' وجود میں آئی۔ سرحدوں کی تقسیم سے جو ہجرت عمل میں آئی وہ اپنے اندر ظلم و بربریت کی ایسی خونچکاں حکایات اور خون آشام داستانیں لائی کہ جس کے سامنے انسانیت سرنگوں ہوگئی۔ تاہم اس وقت لوگوں کے سامنے ایک واضح مقصد اور نصب العین تھا کہ جس کے باعث وہ یہ سب کچھ خندہ پیشانی سے برداشت کرتے گئے اور منہ سے نکلنے والی آہوں اور سسکیوں کو اسی نصب العین کی صدا میں گم کرنے کی شعوری کاوش میں مصروف رہے۔ تاہم یہ بڑی عجیب بات ہے کہ ۱۹۴۷ء میں تو مذہبی، معاشرتی اور ثقافتی اقدار کے اختلاف نے ایک اقلیتی جماعت (مسلمانوں) کو برصغیر میں اپنے جداگانہ تشخص کے حصول کے لیے متحرک کیا تھا لیکن ۱۹۷۱ء میں تہذیبی و ثقافتی اور لسانی اختلافات کو بنیاد بنا کر علیحدگی کا مطالبہ کرنے والے تو ایک ہی نظریۂ حیات (اسلام) پر یقین رکھنے والے اور مشترکہ مذہبی نظام کے پروردہ تھے (کہ جنہوں نے آزادی و خودمختاری اور جداگانہ شناخت کے لیے مشترکہ کوششیں اور ۴۷ء کے دلخراش اور خوفناک واقعات میں برابر قربانیاں دی تھیں۔ تو پھر کیونکر تحریکِ آزادی کے ہراوّل دستے میں برابر کے یہ شریک اور ساتھی متحدہ اسلامی مملکت میں بھی اپنے لئے آزادی خودمختاری کا تقاضا کرنے لگے کہ جس سے دھڑے بندی کا شکار ملکی سیاست و سالمیت بحرانی کیفیت سے دوچار ہونے لگی۔ اگرچہ مشرقی پاکستان کے بنگلہ دیش بننے تک کے سفر کی ایک بنیادی اور اہم وجہ معاشی وسائل کی غیر مساوی تقسیم بھی تھی کیونکہ مغربی پاکستان میں جاگیردارانہ نظام و مزاج رائج تھا اور مشرقی پاکستان کے مقابلے میں یہاں وسائل کی بھی کسی حد تک فراوانی تھی ملکی آمدنی کا بیشتر حصہ مغربی پاکستان کے ترقیاتی کاموں میں خرچ کیا جاتا تھا۔ جب کہ دوسری طرف مشرقی پاکستانی کی غربت و افلاس اور فاقہ کشی نے بنگالیوں کی زندگیوں کو اجیرن کر رکھا تھا۔ جس سے ان کے اندر مغربی پاکستان کے تسلط اور اپنی محرومی کا احساس بڑھنے لگا۔ اس غربت کے حوالے سے صدیق سالک لکھتے ہیں:

> ''راستے میں جہاں جہاں رُکا بھِک منگوں کے غول کے غول مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ میں نے محسوس کیا کہ بنگال کا عام غریب آدمی مغربی پاکستان کے انتہائی غریب سے بھی غریب تر ہے مجھے مشرقی پاکستان کی معاشی بدحالی کے بارے میں سُنی ہوئی باتوں میں وزن نظر آنے لگا ___ میں اپنے آپ کو مجرم محسوس کرنے لگا۔''[۱]

تاہم یہ ایک حقیقت ہے کہ مشرقی پاکستان کے علیحدگی کے تقاضے سے قائداعظم اور علامہ اقبال کے دو قومی نظریہ پر قائم ہونے والی اسلامی ریاست بھی سوالیہ نشان بننے لگی۔ شہزاد منظر قیام پاکستان کے بعد اخوت و یک جہتی کے بگاڑ کا سبب اس وقت کی فوجی حکومت اور مغربی پاکستان کے جاگیردارانہ مزاج کو قرار دیتے ہیں۔

''فوجی آمر جنرل یحییٰ اور مغربی پاکستان کے جاگیر دار طبقے اور اس کی جانب سے بنگالی مسلمانوں کو ان کے حقوق سے محروم رکھنے کی کوششوں کے ردِعمل میں بنگالی قوم پرستی پروان چڑھی۔''[۲]

نتیجتاً ہر طرف نفرت و انتقام کے شعلے بلند ہونے لگے۔ شکوک و شبہات اور خوف و ہراس کی اِس فضا میں ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کو ڈھاکہ کے ریس کورس گراؤنڈ میں جنرل نیازی نے ہتھیار ڈالنے کی دستاویز پر دستخط کر کے بنگلہ دیش کے قیام کی پہلی اینٹ رکھ دی۔ سقوطِ مشرقی پاکستان کے سانحے اور بنگلہ دیش کے قیام سے جہاں لاکھوں مسلمانانِ برصغیر کی قربانیوں پر ایک کاری ضرب پڑی وہیں پاکستان بھی پانچ سے چار صوبوں کی سرزمین بن کر تقریباً آدھا رہ گیا۔ ہجرت اور جلاوطنی کا سلسلہ از سرِ نو شروع ہوا۔ وقوع پذیر ہونے والی یہ دوسری ہجرت ایک بار پھر اردو افسانے کا موضوع بنی بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اِس بار کی ہجرت و تقسیم سے پیدا ہونے والی شکستگی نے تو کرب کے احساس کو بھی دوہرا کر دیا۔ بقول سلیم آغا قزلباش:

''اور جب مشرقی پاکستان کے مغربی پاکستان سے کٹ کر بنگلہ دیش بن جانے کے بعد بہاریوں کی مغربی پاکستان یعنی پاکستان کی جانب ہجرت کا سلسلہ شروع ہو گیا تو اس ہجرت نے ۱۹۴۷ء کی یاد تازہ کر دی۔ مندمل زخم ایک بار پھر ہرے ہو گئے، مگر فرق کے ساتھ کہ تقسیمِ ہندوستان کے وقت بے خانماں مسلمانوں کو لگنے والے چرکے غیر مسلموں کے ظلم کا نتیجہ تھے، مگر اس بار سر پر قیامت اپنوں کی وجہ سے ٹوٹی تھی۔ لہٰذا اذیت بھی زیادہ محسوس ہوئی۔''[۳]

جہاں تک اُردو افسانے کا تعلق ہے تو سانحہ مشرقی پاکستان یا سقوطِ ڈھاکہ کا موضوع اُردو کے افسانوی ادب میں تین مختلف ذرائع سے منظرِ عام کا حصہ بنا۔ پہلی قسم میں وہ لوگ شامل ہیں جنہوں نے براہِ راست اِس بدترین ظلم و بربریت اور انسانیت کُش حادثات کو دیکھا اور اپنے جسموں پر سہا۔ دوسری قسم میں وہ ادیب شامل تھے کہ جنہیں بسلسلہ ملازمت یا کسی اور سبب مشرقی پاکستان میں کچھ عرصہ قیام کرنا پڑا نیز سقوط کے وقت بھی وہ وہاں موجود تھے۔ جب کہ تیسری قسم میں وہ کہانی کار شمار کیے جا سکتے ہیں جو ویسے تو مستقل مغربی پاکستان کا حصہ رہے، لیکن اُنہوں نے اس سانحے کو چشمِ تخیل سے محسوس کر کے اپنی کہانیوں کا موضوع بنایا۔[۴] میرا موضوع اِس وقت چونکہ اُردو افسانہ ہے لہٰذا ذیل میں حروف تہجی کے اعتبار سے افسانہ نگاروں کی کہانیوں میں اس موضوع کی پیشکش کو پرکھا جائے گا۔ دوہری ہجرت اور دوہرے کرب کا شکار، اپنے تہذیبی و نسلی رشتوں کے لیے تڑپتے یہ مہاجرین اور منقسم خاندان، اختر جمال کے افسانوں میں شدتِ غم میں ڈوبے دکھائی دیتے ہیں کہ قیامِ پاکستان اور سقوطِ مشرقی پاکستان کے نتیجے میں اختیار کی جانے والی ہجرتیں اور اُن کے بطون سے پھوٹنے والی کرب و اذیت کی جھلکیاں تسلسل کے ساتھ اُن کے ہاں موضوع بنتی نظر آتی ہیں۔ اُن کی کہانیوں کے کردار پے در پے ہونے والی ان ہجرتوں کی بدولت کرب و اضطراب اور مایوسی و شکستگی سے اس طرح دوچار ہوتے نظر آتے ہیں کہ جیسے یہ اُفتادگی و درماندگی ازل سے اُن کے

مقدر میں لکھ دی گئی ہو۔ ہجرت اور بے گھری کا شکار بیشتر کردار اللہ کی اتنی بڑی زمین پر کہیں بھی اپنے لیے جائے پناہ ڈھونڈنے سے قاصر دکھائی دیتے ہیں۔ اس حوالے سے 'دوسری ہجرت' کو اختر جمال کا کامیاب افسانہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ کہانی کا خلاصہ کچھ یوں ہے کہ ۱۹۴۷ء میں کلکتہ سے ہجرت کر کے ڈھاکہ آنے والے منشی سرفراز حسین کو کچھ عرصہ بعد ہی ڈھاکہ کی گلیوں میں رقص کرتی موت نظر آتی ہے۔ پہلی ہجرت میں بہت کچھ گنوانے والے اس منشی سرفراز حسین کو اور اُن کے خاندان ایک بار پھر ہجرت کے عمل سے گزرنا پڑتا ہے۔ لہٰذا ائیر پورٹ پر موجود منشی سرفراز حسین کی احساسِ مہاجرت اور بے گھری کے احساس سے دوچار پوتی کہتی ہے:

''ابا جان یہ امریکی ہر مشکل میں مدد کو تیار رہتے ہیں۔ ان سے کہیے کہ چاند پر مہاجروں کی بستی بسا دیں۔ ساری دُنیا کے مہاجر وہاں اپنا گھر بنالیں گے۔''[۵]

یہاں لسانی تعصب کا شکار اُن کا چھوٹا بھائی اِس بات کا اضافہ کرتا ہے کہ وہاں جا کر ہم خوب زور زور سے اُردو بولیں گے۔

''منشی صاحب نے ان دونوں کی باتوں کا جواب نہ دیا۔ وہ سوچ رہے تھے کہ پہلے آزادی نے لُوٹا۔ پھر جمہوریت نے لوٹا۔ آخر ہمارے حصے میں ہر بار لوٹ ہی کیوں۔''[۶]

اِسی موضوع پر اختر جمال کا ایک اور افسانہ ''پسِ دیوارِ زنداں'' بھی ہے۔

سقوطِ ڈھاکہ یا سانحہ بنگلہ دیش کے حوالے سے لکھنے والوں میں دوسرا اہم نام اُمِ عمارہ کا قرار دیا جاتا ہے کہ اُنہوں نے مشرقی پاکستان سے تعلق رکھنے والے اس سانحے کے اثرات ونشانات کا براہِ راست مشاہدہ ومطالعہ کیا۔ لہٰذا اپنے افسانوں میں وہ اس سقوط کے ان عوامل کو بھی پرکھنے کی کوشش کرتی ہیں جو اس تقسیم یا سانحے کا موجب بنے۔ انتظار حسین کی طرح اُمِ عمارہ بھی اپنے افسانہ ''طوطا مینا کی نئی کہانی'' میں ہابیل وقابیل کے اساطیری حوالے سے انسان کی طمع و لالچ کو موضوع بناتی نظر آتی ہیں۔ افسانے میں امن وآشتی کی علامت سمجھے جانے والے دو پرندے طوطا اور مینا انسانی فطرت وسرشت کے کریہہ پہلو خودغرضی کو اس طرح ہمارے سامنے لاتے ہیں کہ جسے وہ اپنی دانست میں مشرقی پاکستان میں پیدا ہونے والے مسائل کا لازمی نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ بوڑھی گنگا کے کنارے مچھلیوں کی طرح تیرتی انسانی لاشوں کو دیکھ کر عالمِ ذکھ میں وہ آپس میں یوں گفتگو کرتے ہیں۔ ''دلوں میں وسعت نہیں۔۔۔ ذاتی دنیا۔۔ ذات کی بقا۔۔ ذاتی مفاد۔۔ ارے یہ انسان۔۔''[۷]

جہاں تک انتظار حسین کا تعلق ہے تو انتظار حسین کا نام بھی ہجرت ومسافرت اور احساسِ تنہائی سے پیدا ہونے والے حُزن وملال کے اظہار کے حوالے سے اس طرح مخصوص ہے کہ جنہیں اپنے تہذیبی ورثے، مٹی، آبائی یادگاروں اور جڑوں سے بچھڑ جانے کا ملال کسی آن چین نہیں لینے دیتا اور ماضی کی یاد انہیں زمانہ؟ حال سے مطابقت پیدا نہیں کرنے دیتی۔ نتیجتاً وہ نئی سرزمین کے ساتھ کسی بھی قسم کا رشتہ اُستوار کرنے میں دُشواری محسوس کرتے ہیں۔

اِس بات میں اگر چہ شک نہیں کہ انتظار حسین کے افسانوی کردار اپنے ماضی و شناخت کے گم گشتہ اوراق کی تلاش و دریافت میں حزن و ملال کا شکار دکھائی دیتے ہیں تاہم اِس بات میں قطعاً صداقت نہیں کہ نئی سرزمین کی طرف قدم بڑھاتے اُنہیں کوئی پچھتاوا یا ملال ہے کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو قرۃ العین حیدر کی طرح وہ بھی کب کا اپنی جنم بھومی یا آبائی سرزمین کی طرف لوٹ گئے ہوتے اور دوبارہ اُس سرزمین میں اپنا مقدر تلاش کرنے کی کوشش کرتے جسے وہ چھوڑ آئے تھے۔ اُن کا المیہ اور ہے کہ ناصر کاظمی کی طرح وہ بھی اپنے ماضی کو اپنے حال میں زندہ رکھ کر مسرت و انبساط حاصل کرنا اور احساسِ اجنبیت کو مانوسیت سے تبدیل کر دینا چاہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ترقی پسند تحریک کے سرگرم نقاد و افسانہ نگار ڈاکٹر انوار احمد بھی یہ تسلیم کرتے نظر آتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر انوار احمد:

> ''یہ کوئی راز نہیں کہ ترقی پسند انتظار حسین سے اور انتظار حسین ترقی پسندوں سے چڑے ہوئے ہیں مگر یہ امرِ واقعہ ہے کہ انتظار حسین ماضی کی بھول بھلیوں میں گم ہو کر نہیں رہ جاتا، وہ ہمارے ان عظیم افسانہ نگاروں میں سے ہے جو اپنے عہد کی گواہی دے رہے ہیں، انتظار حسین کے مجموعے ''شہرِ افسوس'' میں یہ گواہی، اجتماعی دُکھ میں شرکت کی مخلصانہ آرزو سے معتبر ہوتی ہے۔''[۸]

مجموعی طور پر اگر دیکھا جائے تو ۴۷ کی طرح ۷۱ کے سقوط کے حوالے سے بھی ہمارا ادیب و شاعر مشترکہ تہذیب و روایات اور مذہب کے حامل وامین لیکن دھڑے بندی کے شکار ہر دو معاشروں سے نالاں دکھائی دیتا ہے۔ انتظار حسین بھی اپنی کہانیوں میں ایک دوسرے کا لہو چوسنے والے اِن دونوں بھائیوں (مشرقی و مغربی پاکستان) سے اپنی ناراضگی کا بھرپور اظہار کرنے کے ساتھ ساتھ ظلم و بربریت کو ایک دوسرے کا مقدر قرار دیتے ہیں۔ اُن کے افسانوی مجموعہ ''شہرِ افسوس'' میں ہر دو اسلامی تہذیب و روایات کے حامل معاشروں کا یہی زوال ہی حزن و ملال کا سبب بنتا دکھائی دیتا ہے۔ ''وہ جو کھوئے گئے''، ''وہ جو دیوار کو نہ چاٹ سکے'' اور شہرِ افسوس وغیرہ ایسے افسانے اسی صورتحال کی ہی عکاسی کرتے ہیں۔

> ''بُوڑھے نے اُنہیں افسوس کے ساتھ دیکھا اور کہا کہ 'چاٹنا یاجوج ماجوج کی زبانوں کا مقدر ہے وہ سدِ سکندری کو نہیں چاٹیں گے تو اپنا لہو چاٹیں گے۔''[۹]

ایک اور افسانہ 'صبح کے خوش نصیب' میں بھی انتظار حسین ۴۷ء میں جان بچا کر آنے والے ۷۱ میں دوہرے مہاجرین کے پچھتاوے اور کسک و ملال کو موضوع بناتے ہیں۔

> ''ہم گاڑی میں بیٹھے لوگ کس طرح ایک احساسِ تحفظ کے ساتھ اُن پر ترس کھا رہے تھے جو پیچھے رہ گئے تھے۔ اب وہ ہم پر ترس کھائیں گے۔ خوش نصیبی اور بدنصیبی کا کتنی جلدی آپس میں تبادلہ ہو گیا۔ صبح کے خوش نصیب شام ہوتے ہوتے بدنصیب بن چکے ہیں۔ اچھے رہے وہ لوگ جو گاڑی میں سوار نہ ہو سکے اور ایک وقتی بدقسمتی سے گزر کر خوش قسمت بن گئے۔''[۱۰]

جمیل عثمان کی ''جلاوطن کہانیاں'' بھی سقوطِ ڈھاکہ کی سلگتی وہ تصویریں ہیں جن میں ۴۷ء میں ایک خوفناک جنگ کا سامنا کرنے والے بے بس مہاجرین مشرقی پاکستان میں آباد ہونے کے بعد ۷۱ء کے سانحے میں ایک بار پھر پُرانے زخموں کے ساتھ بے زمین و بے مکاں نظر آتے ہیں۔ جمیل عثمان کی یہ کہانیاں پاکستان سے محبت کرنے اور اُس کی حُرمت پر قربان ہونے والے مہاجرین کے دُکھوں سے عبارت ہیں جنہیں مشرقی پاکستانیوں نے تو خود سے اِس لیے کاٹ کر جُدا کر دیا تھا کہ اُنہیں ہر اُس چیز سے نفرت ہوگئی تھی جس سے متحدہ پاکستان سے وابستگی یا رغبت کا اظہار ہوتا تھا المیہ یہ ہے کہ دوسری طرف مغربی پاکستان میں بھی ان مجبور و بے بس اور محبِّ وطن پاکستانیوں کی کوئی دادرسی نہ ہوسکی اور اُنہیں معیشت پر بوجھ ہی سمجھا گیا۔

> ''کسی ملک سے محبت اور وفاداری کی اتنی سخت سزا انسانی تاریخ میں شاید ہی کسی گروہ کو ملی ہو جتنی ان بدنصیب لوگوں کو ملی ہے کہ تین نسلوں سے وہ یہ سزا بھگت رہے ہیں اور اب بھی اِس سے نکلنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔''[۱۱]

''پرچم ستارہ و ہلال''، ''وہ ایک سجدہ'' اور ''باشار چاچا'' جمیل عثمان کے ایسے افسانے ہیں کہ جن کے کردار مشرقی پاکستان میں رہنے کے باوجود ۷۱ء کی ناسازگار فضا میں بھی متحدہ پاکستان کے خواہاں دکھائی دیتے ہیں۔ ہر دو طرف بے سروسامانی کا شکار یہ کردار ہجرت و ترکِ وطنیت کے عمل پر سوالیہ نشان ہیں۔

> ''زرینہ! صفی اللہ بولے۔ ''لوگ کہتے ہیں کہ وقت زخموں کا مرہم ہے لیکن آج چوبیس برس کے بعد میرے زخم کیوں رِس رہے ہیں؟ مجھے تو اپنے گھر کے جلنے کا اس روز بھی غم نہیں تھا، جس روز وہ جلا تھا، پر آج مجھے اپنا نقصان کیوں یاد آ رہا ہے؟ بتاؤ زرینہ! میری پشتوں کی کمائی کیوں لُٹی تھی؟ تمہارے والدین کیوں کٹ مرے تھے؟ نگینہ کو زندہ آگ میں کیوں ڈالا گیا تھا؟ کیا آج ہی کے دن کے لیے؟''[۱۲]

حسن منظر ایسے باشعور افسانہ نگار کے ہاں اِن سب صورتوں کے بڑی عقلی و منطقی جواز ملتے ہیں۔ اپنے افسانوں میں وہ مشرقی پاکستان کے لوگوں کی مفلوک الحالی، معاشی تنگدستی سے جنم لینے والی بدحالی اور مظلومیت کے ساتھ ساتھ مغربی پاکستان کے بے نیاز رویے کو اِس طور پیش کرتے ہیں کہ اُن کی کہانی قصہ پن اور فن کو مجروح کیے بغیر غیر جانبداری کی معراج کو چھونے لگی ہے۔ وہ اپنی کہانیوں میں اُن اسباب کا بھی بے باکانہ تنقیدی جائزہ لینے کی کوشش کرتے ہیں کہ جن کے نتیجے میں ہمیں دُنیا کے سامنے ہزیمت سے دوچار ہونا پڑا۔ اُن کے افسانے ''انسان کا دیش'' اور ''برطانوی قبریں'' اس حوالے خصوصی طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

''انسان کا دیش'' میں مرکزی متکلم کردار ''ابدل'' مشرقی پاکستان کے مونبر رحمٰن بحری جہاز کے دیگر کرداروں کے مکالموں کے ذریعے ہر دو طرف کے تحفظات کو ہمارے سامنے لاتا ہے۔ جب کہ تقسیم و ہجرت اور

اپنوں کی ستم ظریفی کا شکار ہونے والے بہاری مہاجرین کی پے در پے مسافرت وجلاوطنی سے جنم لینے والا ان کا ایک اور اہم افسانہ ''برطانوی قبریں'' ہے جس میں موجود بیانیہ کہانی اپنے اندر تہہ در تہہ معنویت اور پہلوداری لیے ہوئے ہے۔ یہ افسانہ کہانی کے مرکزی کردار ڈاکٹر نورل کی جھلاہٹ سے شروع ہوتا ہے جسے برطانوی پروٹشل سیکرٹری کے اس حکم کی تعمیل کرنا ہوتی ہے کہ حکومت برطانیہ سے عہد نبھاتے وفاداروں کی قبروں کو تلاش کیا جائے تا کہ حکومت برطانیہ اپنے ان وفاداروں کو خراج تحسین پیش کر سکے۔ جبکہ نورل کے لئے مرے ہوئے لوگوں کی قبروں کو تلاش کرنا ایک بے معنی فعل ہوتا ہے جس کا اظہار وہ اپنے برطانوی پروٹشل سیکرٹری کے سامنے بھی کر دیتا ہے۔ جس پر وہ پروٹشل سیکرٹری نورل کو طنزاً یوں جواب دیتا ہے:

> ''یہی فرق تم میں اور ہم میں ہے۔ تم جب ایک ملک چھوڑتے ہو تو پیچھے رہ جانے والے زندوں کو بھی بھول جاتے ہو۔ ہم اُن مردوں کو بھی نہیں بھولتے ہیں جنہوں نے برطانیہ عظمیٰ کی خدمت میں جان دی "There will always be England. Good day." یہ کہتے ہوئے فرینکلن راؤڈی۔ بُش سر سے پیر تک کانپ رہا تھا۔''[۱۳]

اسی طعنے کو سن کر سبب نورالامام عرف نورل ضبط اور برداشت کے سارے بند توڑ بیٹھتا ہے اور استعفیٰ دینے پر تیار ہو جاتا ہے۔ لیکن کیا ۱۷ء کی جنگ کے بعد کیمپوں میں بیکاری کی زندگی گزارنے والے گلتے سڑتے بہاریوں کے وجود کے حوالے سے راؤڈی۔ بُش کا یہ طعنہ اگر ہمارے مُنہ پر طمانچہ نہیں تو پھر اور کیا ہے؟

''ندیا کہاں ہے تیرا دیس'' کے مصنف شہزاد منظر چونکہ عملاً خود پے در پے ہجرتوں کا شکار ہوئے، قید سہی اور جسمانی ہجرت کے ساتھ ساتھ ذہنی جلاوطنی و ہجرت کے کرب و اذیت کو برداشت کیا۔ لہذا اُن کے اس اہم افسانوی مجموعہ کے منظر و پس منظر کی بنیاد بھی ۴۷ء و ۷۱ء کی ہجرتیں ہیں۔

بنیادی طور پر اِس مجموعے کے افسانوں کو شہزاد منظر نے تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ تاہم مجموعے کے دوسرے حصے میں ہجرت کے کرب کو سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اُن کے افسانوں میں مُکتی باہنی اور بنگلہ دیش کے قیام کے ساتھ ساتھ بہاریوں پر ہونے والے ظلم وستم کی بے باک تصویریں ملتی ہیں۔ اُن کے ہاں ہندوستان سے ہجرت کر کے آنے والے مہاجرین نئی سرزمین کو اپنے لیے مبارک و مقدس سمجھتے ہوئے اُس پر قربان ہو جانے اور اُس کی تہذیب و ثقافت کو اپنا بنانے کے لیے ہر دم تیار نظر آتے ہیں، لیکن پھر بھی بے گھری و در بدری اور ذہنی و جسمانی ہجرت مقدر کی طرح اُن کا پیچھا کرتی رہتی ہے۔ رات کا پچھلا پہر، پچھتاوا۔ اجنبی اور تیسرا وطن کم و بیش اسی صورتحال کی عکاسی کرتے ہیں۔

> ''میں یہاں آنا جانا بند کر دوں؟ اس لیے کہ لوگ مجھے مشتبہ نظروں سے دیکھتے ہیں؟ لیکن میں ایسا کیوں کروں؟ میں بھی تو تم ہی میں سے ہوں۔ میرے آباء اگرچہ باہر سے آئے ہیں، لیکن میں تو

بنگالی ہوں۔ میں بھی تمہاری جدوجہد میں شامل ہوں۔ مجھ میں اور تم میں کیا فرق ہے۔''[۱۴]

شہزاد منظر کی طرح طارق محمود بھی اپنے افسانوں (''آئی لینڈ''، ''لال باغ'' اور ''سرکس'') میں کئی سوالات نظر آتے ہیں۔ ان افسانوں میں وہ مشرقی پاکستان کی سرزمین سے جنم لینے والے (قدرتی آفات) مسائل، مخصوص سیاسی سماجی حالات، تنظیمی ڈھانچے کی کوتاہیاں، مقتدر طبقے اور اشرافیہ کی بے نیازی اور عدم توجہی سے تشکیل پاتی بے حسی کی طرف ہماری توجہ مبذول کرواتے ہیں۔ وہ کچھ ایسے چبھتے سوالات بھی اُٹھاتے ہیں جن سے پاکستان کے منقسم ہونے کی راہیں ہموار ہوئیں۔ لال باغ میں طارق محمود مغربی پاکستان کی ادائے بے نیازی اور مشرقی پاکستان کے احساسِ کرب و شکست خوردگی کو اس طرح موضوع بناتے ہیں کہ صاف محسوس ہوتا ہے کہ تحریک پاکستان کی جدوجہد میں ان کی قربانیوں اور یادگاروں کو سرے سے نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

''یار اس شہر میں کوئی ایسی جگہ ہے جس کا ہماری آزادی سے اٹوٹ رشتہ ہو؟ ___

''مدھومیاں کی کینٹین۔'' بنگالی دوست نے دھیرے سے سرگوشی کی

''کیا خاص بات ہے اس جگہ میں۔''

''تم نہیں جانتے۔''

''نہیں یار اب بتا بھی دو۔''

تاریخی شملہ وفد کی تشکیل اور پھر پاکستان کی خالق جماعت مسلم لیگ نے بھی پہلی کروٹ یہیں لی تھی۔[۱۵]

اُردو افسانے کے جدید منظر نامے میں امتیازی مقام کی حامل طاہرہ اقبال ایک ایسی باشعور کہانی کار ہیں کہ جن کا قلم چابکدستی کے ساتھ سماجی حالات و عصری مسائل کا تجزیہ کرتے ہوئے آفاقی نتائج اخذ کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عصری اور تاریخی و تہذیبی شعور کی حامل اس کہانی کار کی نظریں اُن اسباب و عوامل کو بھی ڈھونڈ نکالتی ہیں جن کی بدولت سرزمینِ پاک کو دولخت (۱۹۷۱ء میں) ہونا پڑا، دیگر کئی افسانہ نگاروں کی طرح طاہرہ اقبال بھی ہر دو طرف پیدا ہونے والی نفرت کی وجوہات وسائل و اقتدار کی غیر منصفانہ تقسیم، شرفاء کی شاہ خرچیوں اور مشرقی پاکستانیوں کی غربت و افلاس کو قرار دیتی ہیں اس کے افسانہ ''شپلا کے پھول'' میں پاکستان کے اسی مقتدر اور افسر شاہی طبقہ کے غرور، گھمنڈ اور خود پسند و خود پرست رویے پر ہی طنز ملتا ہے۔ جس میں وہ پاکستانی کمرشل سیکرٹری عادل شاہ خان ایسے پاکستانی بیوروکریٹس اور ڈپلومیٹ آفیسرز کے بے جا اختیارات کے سبب خود کو ناخُدا سمجھنے والے رویے کو ہدف تنقید بناتی ہیں۔

''انڈیا اور بنگلہ دیش کے مقابل اِک عجب احساسِ برتری اور مات دینے کے جذبے کے ساتھ کھل کر جینا۔ کھل کر خرچ کرنا، کھل کر اکڑنا، بڑے بڑے محلات میں رہنے والے بنگالی سیٹھ بھی اس

اسراف کے ساتھ نہ رہتے تھے جیسے پاکستانی سفیر اور ڈپلومیٹ ان لگژری رہائشی گاہوں میں تین چار برس کا یادگاری عرصہ گزار جاتے اور کئی قصے کہانیاں اپنے پیچھے چھوڑ جاتے۔ اصراف، پیسہ، غرور، بے توجہی اور دعوتیں ــــ''۱۶

ان کہانی کاروں کے علاوہ بنگلہ دیشی تہذیب وثقافت سے پیار کرنے والے غلام محمد کے افسانوں میں ہمیں ۷۱ء کے سقوط کی چند ایسی واضح اور نمایاں صورتیں ملتی ہیں جو مغربی پاکستانی کہانی کاروں سے قطعی مختلف نقطۂ نظر کی حامل ہیں۔ ان کی کہانیوں میں بھی ۷۱ء کی مخصوص فضا میں آکٹوپس کی جڑوں کی مانند خوف و دہشت افراد معاشرہ کے رگ و پے میں اس طرح سرایت کرتا دکھائی دیتا ہے، ہر گزرنے والی گھڑی قیامت کے ہنگامے کی خبر دیتی نظر آتی ہے۔ ایسی ہی صورتِ حال کا شکار ان کے افسانہ ''ایک سہا ہوا شخص'' کا متکلم کردار ہے جسے پاس سے گزرتی اور ایمر جنسی کا سائرن بجاتی ایمبولینس کی آوازیں خوفزدہ کر دیا کرتی ہیں۔ تاہم خوف و دہشت کی اِسی فضا میں شعور و ادراک رکھنے والے کچھ لوگ دوست اور دشمن میں امتیاز کرنے کا درس بھی دیتے نظر آتے ہیں جن میں کمبل اوڑھ کر گلیوں میں پھرنے والا وہ شخص بھی شامل ہے جو اِس دشمنی اور المناک صورتِ حال کے تسلسل کا تاریخی شعور و ادراک رکھتا ہے۔

''وہ انتہائی کرب کے عالم میں دوڑتا پھرتا تھا اور سینہ کوبی کرتا تھا اور کہتا تھا کہ اے ہم وطنو! وہ جنگ آج تمہارے شہر میں چھڑ گئی۔ اس لیے کہ تم نے اُنہیں نہیں پہچانا جو اس جنگ کے پیچھے تھے اور تمہارے درمیان موجود تھے۔''۱۷

مجموعی طور پر غلام محمد کی بیشتر کہانیوں میں علامتی رنگ پایا جاتا ہے اور اُن کے ہاں افسانہ کسی واقعے کے بجائے نتیجے اور تاثر کا حامل دکھائی دیتا ہے۔ 'آپریشن' 'سرچ لائٹ'، 'نیند، سزا'، 'کلی جگ' اور 'خاموش سہمے ہوئے لوگ' وغیرہ اس موضوع کے حوالے سے ان کے اہم افسانے قرار پاتے ہیں۔

مسعود اشعر کا شمار ۷۰ء کی دہائی میں لکھنے والے اُن افسانہ نگاروں میں کیا جا سکتا ہے جن کا محض سماجی تاریخی شعور ہی اُن کے تخلیقی اظہار میں نہیں ڈھلا مغربی ادب کا گہرا مطالعہ اور رجعت پسندی کے خلاف غم و غصے کی حد تک جھلاہٹ نے بھی اُن کی کہانیوں کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے۔ اُن کے افسانوی مجموعے ''آنکھوں پر دونوں ہاتھ'' کے متعدد افسانے ۷۱ء کے اِسی آشوب کی روداد ہیں۔ ان کے ہاں بے سمت مسافر اندھیرے میں سفر کرنے پر مجبور دکھائی دیتے ہیں۔ ''ہم ایک سرنگ سے نکلنے کے لیے دوسری سرنگ میں داخل ہو جاتے ہیں۔''۱۸

جہاں تک مسعود مفتی کا تعلق ہے تو اُن کا شمار ایسے ادیبوں میں ہوتا ہے جنہیں بوجہ ملازمت وقت مشرقی پاکستان گزارنا پڑا۔ وہ پاکستانی المیے (سقوطِ ڈھاکہ) کے عینی شاہد اور شکار ہونے والے افسانہ نگار کی حیثیت سے مشرقی پاکستان میں امن و امان کی بگڑتی صورتِ حال کو اپنی رپورتاژ (چہرے)، ڈائری (لمحے) اور افسانوی مجموعہ

(ریزے) کا مرکزی موضوع بناتے ہیں وہ سقوطِ ڈھاکہ کے المیہ کی ایک ادبی تاریخ مرتب کرنے کی شعوری کوشش کرتے ہیں۔

''ریزے'' کے (افسانوں) میں ۱۹۷۱ء کے ڈھاکہ کی گلیوں میں زندگی، عزت و آبرو اور جان و مال کی پامالی کے تاریخی واقعات کو پیش کرتے ہیں کہ ان واقعات کے وہ خود ناظر بھی ہیں اور متکلم بھی۔ اپنی کہانیوں میں اُن کا زیادہ تر اصرار واقعات و بیانات کی صداقت پر ہوتا ہے۔ تاہم واقعات کی قطعیت سے اتفاق کرنے کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ سوچی سمجھی اسکیم کے تحت لکھی جانے والی یہ کہانیاں (واقعاتی شہادت کے باوجود) قدرتی ارتقاء سے محروم نظر آتی ہیں۔ خوش قسمتی، جال، صدیوں پار، سپنا، امید، کفارہ اور باغی وغیرہ ان کے ایسے افسانے ہیں کہ جن میں واقعاتی صداقت تو موجود ہے تاہم بیشتر مقامات پر کہانی کا فن بھی مجروح ہوتا نظر آتا ہے۔

مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ سقوطِ ڈھاکہ ہماری تاریخ کا ایسا تکلیف دہ سیاسی و سماجی سانحہ تھا کہ جس نے ظلم و ستم اور جبر و استبداد کے سامنے انسانیت کو سرنگوں کر دیا اور جس میں ۱۹۴۷ء میں ہجرت کو نصب العین بنا کر گھر بار چھوڑنے والے اور ایک ہی مذہب کے پیروکار مہاجرین ایک دوسرے کے دشمن بن گئے۔ بدلتی ہوئی اس سیاسی سماجی صورتحال کی ایک معتبر گواہی پاکستانی اردو افسانے میں بخوبی دیکھی جا سکتی ہے۔

حواشی

۱۔ صدیق سالک، میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا، (لاہور: الفیصل پبلشرز، ۲۰۱۲ء)، ص ۱۵

۲۔ شہزاد منظر، پاکستان میں اُردو افسانے کے پچاس سال، (کراچی: پاکستان اسٹڈی سنٹر، ۱۹۹۷ء)، ص ۲۰۶

۳۔ سلیم آغا قزلباش، جدید اُردو افسانے کے رجحانات، (کراچی: انجمن ترقی اُردو، ۲۰۰۰ء)، ص ۵۲۶

۴۔ طاہرہ اقبال، ڈاکٹر، پاکستانی اُردو افسانہ سیاسی وسماجی تموجات کے تناظر میں، غیر مطبوعہ مقالہ برائے پی ایچ، ڈی، شعبہ اُردو، فیصل آباد یونیورسٹی، ۲۰۱۲ء

۵۔ اختر جمال، زرد پتوں کا بن، (لاہور: التویر اُردو بازار، ۱۹۸۱ء)، ص ۵۰

۶۔ ایضاً

۷۔ اُم عمارہ، طوطا مینا کی کہانی، مشمولہ: ماہِ نو، شمارہ ۶، جلد ۲۴، جون ۱۹۸۹ء، ص ۲۶

۸۔ انوار احمد، ڈاکٹر، اُردو افسانہ ایک صدی کا قصہ (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان ۲۰۰۷ء)، ص ۵۷۵

۹۔ انتظار حسین، شہرِ افسوس، (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء)، ص ۱۸۱

۱۰۔ انتظار حسین، کچھوے، (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء)، ص ۱۴۵
۱۱۔ جمیل عثمان، حکایت دل (پیش لفظ) مشمولہ: جلاوطن کہانیاں، (کراچی: بزمِ تخلیق ادب، ۲۰۱۳ء)، ص ۲۷
۱۲۔ ایضاً، ص ۳۲
۱۳۔ حسن منظر، خاک کا رُتبہ، (کراچی: شہرزاد پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء)، ص ۶۶
۱۴۔ شہزاد منظر، کچھ اِس کتاب کے بارے میں، مشمولہ: ندیا کہاں ہے تیرا دیس، (کراچی: منظر پبلی کیشنز، ۱۹۹۰ء)، ص ۸۸
۱۵۔ طارق محمود، سہ حدہ، (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۳ء)، ص ۳۴
۱۶۔ طاہرہ اقبال، شپلا کے پھول، مشمولہ: کولاژ، شمارہ ۱، اگست تا اکتوبر، کراچی ۲۰۱۲ء، ص ۳۸
۱۷۔ غلام محمد، انگلیاں ریشم کی، (کراچی: نثری دائرہ، ۲۰۰۰ء)، ص ۲۶
۱۸۔ مسعود اشعر، سارے فسانے، (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۷ء) ص ۱۹۳

مآخذ:

۱۔ اختر جمال، زرد پتوں کا بن، لاہور: التو یر اُردو بازار، ۱۹۸۱ء
۲۔ انتظار حسین، شہرِ افسوس، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء
۳۔ انتظار حسین، کچھوے، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء
۴۔ انوار احمد، ڈاکٹر، اُردو افسانہ ایک صدی کا قصہ، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان ۲۰۰۷ء
۵۔ حسن منظر، خاک کا رُتبہ، کراچی: شہرزاد پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء
۶۔ سلیم آغا قزلباش، جدید اُردو افسانے کے رجحانات، کراچی: انجمن ترقی اُردو، ۲۰۰۰ء
۷۔ شہزاد منظر، پاکستان میں اُردو افسانے کے پچاس سال، کراچی: پاکستان اسٹڈی سنٹر، ۱۹۹۷ء
۸۔ صدیق سالک، میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا، لاہور: الفیصل پبلشرز، ۲۰۱۲ء
۹۔ طارق محمود، سہ حدہ، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۳ء
۱۰۔ غلام محمد، انگلیاں ریشم کی، کراچی: نثری دائرہ، ۲۰۰۰ء
۱۱۔ مسعود اشعر، سارے فسانے، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۷ء